ابو جہل نے خریدی فلیٹ اسٹریٹ

لیل و نہار / محمد عامر حسینی

تعارفی نوٹ

مضمون نگار کی طرف سے

یہ مضمون دراصل ایک سوال کا عملی جواب ہے—ایک ایسا سوال جو آج کے فکری، تہذیبی، اور ادبی جمود کے درمیان ابھرتا ہے، سرگوشی کرتا ہے، اور پھر دھاڑنے لگتا ہے:

"آج ادبی مضمون کا اسلوب کیا ہو؟"

"ادب میں کیا لکھا جائے؟"

آج کا ادبی مضمون اگر صرف تحلیل، تجزیہ یا مروجہ معروضی اسلوب کے قالب میں قید ہو کر رہ جائے، اگر وہ اس زمانے کی بدبو کو کاٹ نہ سکے، اس کے جھوٹے مہذب چہرے پر تھپڑ نہ مار سکے، تو وہ یا تو بورژوا تفنن ہے، یا جدید اطاعت نامہ۔ اب وہ وقت گزر چکا ہے جب ادب صرف تاثراتی تھا؛ اب وہ زندہ ہے تو یا تلوار ہے یا مصلوب۔ یہی بنیادی یقین اس مضمون کی بنیاد بنا—نہ صرف اس نظم کے معانی کو کھولنے کے لیے، بلکہ اپنی زمین، اپنی زبان اور اپنے زمانے کے زخموں کو ان معنوں میں سمو دینے کے لیے۔

یہ مضمون نزار قبانی کی نظم

"أبو جهل يشتري (فليت ستريت)"

)ابو جہل نے خریدی فلیٹ اسٹریٹ (

پر قائم ہے—ایک ایسی نظم جو اُس کے تخلیقی سفر کی اُن سمتوں کو چھوتی

ہے جن پر اردو دنیا نے اب تک کم توجہ دی ہے۔

نزار قبانی کو اردو میں عام طور پر "محبت"، "عورت"، "جسم"، اور "رومان" کا

شاعر سمجھا گیا ہے۔

اور یہ بات جزوی طور پر درست بھی ہے—کہ اُس کی شاعری میں

عورت نہ صرف حسن بلکہ احتجاج، آزادی، زخم، شہر، اور تہذیب کی

علامت بن کر ابھرتی ہے۔

مگر اس کے شعری تخلیق میں ایک اور جہت بھی ہے—

وہ جہت جو سیاسی مزاحمت، تہذیبی جبر، اور فکری استبداد پر گہری،

تلخ اور بے رحم روشنی ڈالتی ہے۔

یہ نظم اسی سیاسی مزاحمت کی اعلیٰ مثال ہے۔

■نظم کا تاریخی سیاق و سباق:

یہ نظم نزار قبانی نے 1980 کی دہائی میں لکھی، ایک ایسے وقت میں

جب:

- تیل کی معیشت نے عرب دنیا میں ایک نئی طبقاتی خلیج پیدا کر دی تھی؛
- صحافت، ادب اور شعور پر ریاستی و سرمایہ دارانہ قبضے کا آغاز ہو چکا تھا؛
- اور بیرونِ ملک ہجرت کرنے والے عرب دانشور، شاعر اور طالبعلم یورپ میں پہنچ کر دیکھ رہے تھے کہ وہ صرف جغرافیائی جبر سے نہیں، تہذیبی شکست سے بھی دوچار ہو چکے ہیں۔

"فلیٹ اسٹریٹ" — لندن کا معروف مالیاتی مرکز — یہاں استعارہ بن جاتا ہے اس یورپی سرمایہ دارانہ نظام کا جسے عرب کے حکمرانوں نے تیل کے بدلے خریدا، اور پھر خود کو بھی بیچ دیا۔

اور "ابو جھل" صرف تاریخ کا ایک بدنام قریشی سردار نہیں — بلکہ وہ ہر وہ شخص، ہر وہ نظام، ہر وہ ذہن ہے جو طاقت کی بندگی کرتا ہے، اور جہالت کو شاندار لباس میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔

یہ نظم ایک مہاجر شاعر کی تہذیبی خود احتسابی ہے — اور ساتھ ہی تاریخ کے اس لمحے کا سیاسی و فکری مقدمہ ہے، جہاں عرب تہذیب نے مغرب کو تو اپنا کر لیا، مگر اپنی فکری شناخت، علمی مرکزیت، اور سوال اٹھانے کی جرات کھو دی۔

نزار قبانی کی یہ نظم ایک ایسے وقت میں لکھی گئی جب فلسطین پر

خاموشی، لبنان پر بمباری، عراق میں تباہی، اور عرب دنیا میں

جبر و کرپشن کے خلاف بولنے والوں کی تعداد کم ہو رہی تھی، اور درباری شعرا،

فکری تاجروں، اور ریاستی تھنک ٹینکوں کا طوطی بولنے لگا تھا۔

اسی لیے یہ نظم صرف نظم نہیں—

یہ ایک زبان زدہ عہد کا فردِ جرم ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون محض نظم کی فنی تفہیم نہیں، بلکہ اس نظم کو اردو

سماج، پاکستانی ریاست، اردو ادب اور یہاں کے صحافتی منظرنامے سے

جوڑنے کی کوشش ہے۔

یہ نظم ہمیں بتاتی ہے کہ اب نہ صرف لندن بلکہ لاہور، کراچی، اسلام

آباد، قاہرہ، دمشق—سب "فلیٹ اسٹریٹ" کے سامنے سجدہ ریز ہیں، اور

ابو جھل نے صرف سرمایہ نہیں، بلکہ شعور کی زباں، سوال کی تلوار، اور تخلیق کی

گلیاں بھی خرید لی ہیں۔

اسی لیے میں نے اس مضمون کو نزار قبانی کے لہجے میں، اُس کے الفاظ کے

کاٹ، اُس کی سطر کی دھار، اور اُس کے طنز کی ضرب کے ساتھ لکھنے

کی کوشش کی ہے۔

کیونکہ آج ادب کی سطر اگر چاقو نہ ہو،

تو وہ یا تو فیشن ہے یا فریب۔

یہ مضمون اسی چاقو کی تراش ہے—

کہ شاید کوئی لفظ، کوئی قاری، کوئی خیال—اس نظم کے باقی رہ جانے والے سوال سے جواب مانگے:

"کیا یہ نظم واقعی مکمل نہیں ہوئی؟"

آج کل میرے دماغ کی حالت کچھ یوں ہے جیسے تہذیب کی لاش کسی گٹر میں پڑی ہو اور میں اس کے تعفن میں سانس لینے پر مجبور ہوں۔ یہ جو **"بازاری دانش "** ہے— سرمایہ پرست نظام کی دلالی میں لکھتی ہے، اور وہ **"ریاست "** جو ایک کمپنی کی برانچ بن چکی ہے، اس کے استحصالی ڈھانچے کو **ادب کے خوشنما لفافے** میں لپیٹ کر عوام کو **"خوشحالی کی نوید "** سنانے والے **ادیب** اور **قصیدہ خواں شاعر** —یہ سب کے سب اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکے ہیں۔

یہی وہ لمحہ ہے جب پیٹی بورژوا اخلاقیات کا **مصلحتی لبادہ** پھٹنے لگتا ہے، اور تحریر اپنے اندر ایسی "نشر" کی طلب محسوس کرتی ہے جو **"گٹر ادب "** کے بخیے ادھیڑ ڈالے—ایسی زبان، جسے کوئی **بازاری درزی** بعد میں جوڑ نہ سکے۔

میرا دماغ چیخ کر مجھ سے کہتا ہے:

"اگر تُو ایسی نشر نہیں لکھ سکتا تو لکھ مت—جملوں کی قے مت کر کہ یہ فضا مزید متعفن ہو جائے۔"

میں ایسی **بخیہ گر نشر** کے لیے **مہمیز** تلاش کرتا ہوں—اور اکثر مل جاتی ہے۔

لیکن جب اردو شاعری میں مجھے وہ **چاقو کی دھار** نہ ملی، تو میں عربی شاعری کے دیوان کھنگالنے لگا۔

وہیں، ابتدا ہی میں ایک نظم میرے ہاتھ لگی—نزار قبانی کی۔

اور اس کا عنوان مجھے اندر تک چیر گیا:

"أبو جهل يشتري (فليت ستريت)"

)ابو جہل نے خریدی فلیٹ اسٹریٹ (

یہ صرف ایک عنوان نہیں، **زمانوں کے تصادم** کا اعلان تھا۔

ایک جہالت زدہ روح، جو لندن کی **معیشت** پر قابض ہے۔

ایک آئینہ، جس میں ہم سب کی چہروں پہ چپکی ہوئی تہذیب، خوف، مصلحت اور خوشامد کی پرتیں ایک ایک کر کے اترتی چلی جاتی ہیں۔

میرے ذہن میں سوال ابھرتا ہے—

کیا یہ "ابو جہل" محض فلیٹ اسٹریٹ کے فرش پر خریدار بنا گھوم رہا ہے؟

یا وہ ہمارے شہروں، یونیورسٹیوں، نیوز رومز، منبروں، اور مارکیٹوں پر بھی اسی دلیری سے قابض ہے؟

کیا وہ فقط لندن کی دیواروں پر پتھروں سے لکھتا ہے تیل کی عظمت؟

یا وہ یہاں بھی ہمارے ذہنوں پر نقش کر چکا ہے کہ

"قلم وہی معتبر ہے، جو نرخ پر فروخت ہو"؟

یہ جو ہر طرف "ترقی" کا شور ہے، اور "خوشحالی" کے اشتہار،

کیا یہ سب وہی ابو جہل کی جہالت ہے جو اب لفظوں کے لباس میں لپٹی آئی ہے؟

کیا وہی "خریدار" ہمارے اخبارات کے اداریے لکھتا ہے؟

ہمارے کالم نگاروں کی زبان میں بولتا ہے؟

کیا وہ ہماری نظموں کے قافیے خرید چکا ہے؟

ہمارے شاعروں کے استعارے رہن رکھ چکا ہے؟

یہ سوال محض سوال نہیں —

یہ ادب کی قبر پر دستک ہے۔

نزار قبانی کی نظم نے میرے اندر ایک سوال پھونک دیا، اور اب وہ سوال میرے لہو میں اُبل رہا ہے۔ کیا ابو جہل فقط لندن کی فلیٹ اسٹریٹ پر جائیدادیں خرید رہا ہے، یا وہ ہمارے اندر بھی بیٹھا ہوا ہے، ہمارے فیصلے لکھ رہا ہے، ہمارے مدیر چن رہا ہے، ہمارے شاعر چھاپ رہا ہے، اور ہمارے خواب خرید رہا ہے؟ کیا وہ صرف برطانوی مالیاتی اداروں میں بولی لگا رہا ہے، یا ہماری جامعات، تھنک ٹینکس، اور ادبی رسالے بھی اسی کی نیلامی کی میز پر دھری ہوئی چیزیں بن چکی ہیں؟ نزار قبانی کے ہاں ابو جہل ایک تاریخی اسم نہیں، ایک "علامتی سچ" ہے — ایک ایسا سچ جس نے اپنی نئی شکل میں نیا عقال پہن لیا ہے، موبائل ہاتھ میں تھام رکھا ہے، انگریزی بولتا ہے، اور دبئی، لندن، نیویارک کے درمیان فلائٹوں میں آسمان کا خدا بن بیٹھا ہے۔

ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں، وہاں ابو جہل کا نام نہ لینا تو "ادب" کہلاتا ہے، اور اس پر طنز کرنا "غیر ذمے داری"۔ مگر ابو جہل یہاں بھی موجود ہے۔ وہی جاہلیت جو عرب کے ریگزاروں میں عورتوں کو زندہ دفن کرتی تھی، آج وہی جاہلیت صحافت میں سچ کو دفن کر رہی ہے، ادب میں شعور کو دفن کر رہی ہے، اور ریاست میں سوال کو دفن کر رہی ہے۔ اس بار قبر ریت کی نہیں، بلکہ ریٹنگز، پی آر کمپینز، اور "ڈیجیٹل نریٹشنز" کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُس وقت ابو جہل کے پاس تلوار تھی، آج اُس کے پاس میڈیا ہے، ایجنسیوں کے بریفنگ نوٹس ہیں، اور سلیکٹڈ کالم نگاروں کی طویل فہرست ہے۔

ابو جہل نے فلیٹ اسٹریٹ خریدی، اور ہم نے "ضمیر کا سکوائر" گروی رکھ دیا۔ اُس نے صرف لندن کا مالیاتی ضلع نہیں خریدا، اُس نے ہمارے لکھنے والوں کی "ضمیر رُوم" بھی لیز پر لے لی۔ اُس نے خریدے ہوئے انعامات سے ہمارے ذہنوں میں "پبلک انٹیلیکچوئل" تراشے،

اور ہم نے انہی کو نئی نسل کا رہنما مان لیا۔ ابو جہل ہمارے بچوں کے سلیبس میں شامل ہے، ان کے "ہنر" کے سیمینارز میں کلیدی مقرر رہے، وہ ان کے خوابوں کا پروجیکٹ ڈائریکٹر ہے۔ ہم اُسے پہچان بھی نہیں پا رہے، کیونکہ وہ اب اونٹ پر سوار نہیں، بلکہ یو این کانفرنس میں اسمارٹ کارڈ گلے میں ڈالے بیٹھا ہے۔

اس سب کے بیچ میں ادب کیا کرے؟ وہی جو ایک وقت میں شمشیر تھی، آج ایک ڈری سہمی فیس بک پوسٹ بن گئی ہے۔ وہ شاعر، جو کسی زمانے میں ظلم کے درباروں میں جلتے ہوئے الفاظ کے چراغ لے کر کھڑا ہوتا تھا، آج ٹی وی ٹاک شو میں کسی "برینڈڈ موضوع" پر سنسر شدہ قوافی سے واہ واہ لوٹ رہا ہے۔ جو ادیب کسی وقت میں زمانے کی گردن پر سوال رکھتا تھا، آج ایوارڈ شو کی اسٹیج پر دھیرے سے اپنی تقریر میں "معتدل تنقید" کا ایک جملہ بول کر بھی خود کو انقلاب سمجھتا ہے۔ ابو جہل نے فلیٹ اسٹریٹ خریدی، لیکن اس سے بھی بڑا سودا اُس نے تب کیا جب ہمارے ہاں کے ناقدین، دانشور اور لکھنے والے اُس کے برانڈ ایمبیسیڈر بن گئے۔

اور یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرا ذہن، میری تحریر، میرے لفظ — یہ سب اس بدبو سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ مصلحت آمیز تعلیمی مقالوں، خنثیٰ صحافتی اداریوں، اور خوش اخلاق طرزِ تحریر کے برانڈ خوشبو والے بخارات کو اب رد کرتے ہیں۔ میری تحریر چاہتی ہے کہ اگر اس کے لفظ چاقو نہ بن سکیں تو خاموش رہیں — لیکن گھنگرو باندھ کر دربار میں ہرگز نہ جائیں۔ نزار قبانی کی نظم نے میرے اندر وہ چنگاری جلا دی ہے جسے میں مدتوں سے الفاظ کے کمبل میں دبائے بیٹھا تھا۔ اب یہ نظم میرے لیے محض نظم نہیں — یہ میرے قلم کی لوہے کی نوک ہے، اور ہر وہ چہرہ جس پر ابو جہل کا نقاب چڑھا ہے، اب میری نوکِ قلم کے نشانے پر ہے۔

میرے لیے یہ نظم ایک نیا مقدمہ ہے — سماج، ریاست، صحافت اور ادب، سب پر ایک ایک فردِ جرم۔

اور میری تحریر ایک گواہ ہے، جو عدالت کی قسم نہیں، **دل کی آگ** پر حلف دیتی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ لندن سے وہ منظر کھو گیا؟
سرخ بس کا رنگ، جس میں شہر سب کچھ گو گیا؟

ہم جولائے یشربوں سے نوق کو اک شان سے،
اب وہی ہے سواری، دارِ دھند آ کر یہاں؟

قصرِ بکنگھم میں بدو، بے تکلف گھس گئے،
اور ملکہ کے تخت پر بھی، خواب کی سی نیند لی۔

اور انگریزوں نے چپ چاپ اپنی داستاں،
باندھ کر سامان میں، خاموش ہو کر کہہ دیا:

"اب ہمارا وقت تھا، وہ بھی گزر کر جا چکا،"
جیسے ہم بیٹھے تھے کل، اک کھنڈر کے درمیاں۔

کیا واقعی لندن سے وہ منظر کھو گیا؟ کیا واقعی وہ سرخ بس، جو کبھی تہذیب کے بہتے ہوئے شعور کی علامت تھی، اب نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے؟ یا شاید وہ صرف بس نہیں تھی، بلکہ **عقل و شعور کی ایک پرانی تصویر** تھی — جس پر آج **ریشمی دشداشوں والے سرمایہ دار** اپنی نوقیں چڑھا کر گزر رہے ہیں۔ نزار قبانی کے ان اشعار میں صرف طنز نہیں، **تاریخی طنطنہ** بھی ہے۔ ہم جو یشرب کی گردنوں پر اترتے اونٹوں کے وارث تھے، آج فلیٹ اسٹریٹ کی مرسیڈیز میں سوار ہو کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے "ترقی" کر لی ہے — حالانکہ ہم نے صرف **جہالت کو سنہری فریم میں سجا کر تہذیب کا نام دے دیا ہے۔**

قصرِ بکنگھم میں بدو داخل ہو چکے ہیں — یہ مصرع ایک خواب کی تعبیر نہیں، ایک **کابوس کا حقیقت میں بدل جانا** ہے۔ بدو اب صرف صحرا کے باشندے نہیں، وہ **فکری افلاس کے نمائندے** ہیں، جنہوں نے تہذیب کو صرف تخت پر لیٹنے اور اونچی نیند لینے کی چیز سمجھ لیا ہے۔ اور وہ انگریز، جو کبھی تاریخ کے لکھاری تھے، آج **خاموشی کی گٹھڑی اٹھائے**

X

روانہ ہو گئے — وہ اب صرف ماضی کا ایک حوالہ ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ہم کبھی "اندلس کے وارث" ہوا کرتے تھے۔

نزار قبانی کا یہ خواب الٹا ہے — ایک ایسا الٹا خواب جس میں **نو آبادیات کے بچے**، آزاد ہو کر **استعمار کے تخت پر قبضہ** تو کر لیتے ہیں، مگر اپنی **جہالت بھی ساتھ لے آتے ہیں**۔ اور یہ المیہ صرف لندن کا نہیں، **ہمارے اپنے شہروں، ہمارے اداروں، ہمارے نظریات** کا بھی ہے۔

ہم سب اب اسی خواب کے مسافر ہیں، جس میں ہم سمجھتے ہیں کہ **ہم نے کچھ جیتا ہے** — جبکہ درحقیقت ہم **انگریزوں کی طرح خاموشی سے سب کچھ ہار کر** اپنی "عرب نوق / اونٹ" پر **بیٹھے خود کو فاتح سمجھنے لگے ہیں**۔

یہ اشعار کسی بیرونی فتح کا جشن نہیں — یہ **تہذیبی شکست کی گونج ہیں**، اور نزار قبانی ہمیں یہ گونج سنا کر **زخم دکھاتے ہیں، لیکن مرہم نہیں دیتے**۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے اس مرہم کی تلاش کریں — اگر ہم میں اب بھی **زخم کو زخم کہنے کی اخلاقی جرأت باقی ہے**۔

سوہو میں، وِکٹوریا کی سڑکوں پر وہ رقصاں ہیں،
کرتے ہیں حجاز، وہ بدو — کمر خم، پاؤں ننگے ہیں۔

کیا یہ انگریزوں کی سرزمیں ہے، یا یہ ساز؟
بج رہے نعلین کی تالیں — بنے نغمے، انداز؟

کیا یہ انگلینڈ ہے؟ جو خف، عقال میں گم ہو گیا؟
سبحان ربّی! کیسے موسم، کیسی چال، ہو گیا!

سوہو میں، وکٹوریا کی سڑکوں پر وہ بدو رقصاں ہیں — کمر خمیدہ، پاؤں ننگے، پر چہرے فاتحوں جیسے۔ وہ حجاز بجاتے ہیں، جیسے تہذیب اُن کی موروثی ملکیت ہو، جیسے مغرب کی موسیقی اُن کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہو۔ یہ منظر صرف مضحکہ خیز نہیں، **یہ ایک تاریخی**

پیروڈی ہے۔ یہ اُس وقت کا طنز ہے جب عرب نے یورپ سے نہیں، **بلکہ یورپ کے شیشوں میں اپنا عکس دیکھنے کی عادت سے شکست کھائی۔** نزار قبانی نے جب یہ منظر کھینچا تو دراصل وہ **تہذیبوں کے اُس تصادم کا نوحہ لکھ رہے تھے** جو اب "تصادم" نہیں رہا—بلکہ ایک "خرید و فروخت" بن چکا ہے۔ بدو نہ صرف لندن میں گھس آئے ہیں، بلکہ اب وہ جاز بجاتے ہیں، نیویارک کی وائب میں چلتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ **انہوں نے تاریخ فتح کر لی ہے۔**

کیا یہ انگلینڈ ہے؟ وہی انگلینڈ جس کے فلسفی، جس کی سیاسی تحریکیں، جس کے اخبار آزادیِ اظہار کی دہلیز پر بیٹھتے تھے؟ یا یہ وہی سرزمین ہے جہاں اب **نعلین کی تالوں میں جمہوریت کے نغمے بجائے جا رہے ہیں؟** نزار قبانی کا سوال فقط سوال نہیں—**یہ ایک تہذیبی ہنسی ہے،** جو قبر پر کھڑے ہو کر نکالی گئی ہے۔

"کیا یہ انگلینڈ ہے؟ جو خف، عقال میں گم ہو گیا؟"—یہ جملہ تہذیب کی خودکشی کا سندیسہ ہے۔ اب عقال صرف عربی لباس نہیں، یہ ایک **طرزِ فکر** ہے—جو سمجھتا ہے کہ پیسہ ہونے سے علم آ جاتا ہے، تیل ہونے سے تمدن آ جاتا ہے، اور جوتے خرید لینے سے پاؤں مہذب ہو جاتے ہیں۔

نزار قبانی یہاں **انگلینڈ کی شکست** نہیں لکھ رہے، **بلکہ عرب کی "جعلی جیت" کا مرثیہ** لکھ رہے ہیں۔

وہ "سبحان ربی" کہہ کر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے—وہ **خدا کو حیرت میں ڈال دینا چاہتے ہیں** کہ دیکھ، کیسی دنیا بن گئی، کہ جہاں جاہلیت عقال باندھ کر لندن کے فٹ پاتھوں پر چلتی ہے، اور ہم اسے ترقی سمجھتے ہیں۔

یہ اشعار فقط نظم کا حصہ نہیں—**یہ ہماری اجتماعی یادداشت پر سوالیہ نشان ہیں۔** ہم جو تہذیب کے نام پر قافیے لکھتے ہیں، ہم جو "علمی مکالمہ" کے نام پر اسپانسرڈ کانفرنسیں کرتے ہیں، ہم جو صحافت کو فقط کرنسی کا ہنر سمجھتے ہیں—کیا ہم ان بدوؤں سے مختلف ہیں؟ کیا ہم

اُس انگلینڈ سے بہتر ہیں جواب **خاموش ہے، تھکا ہوا ہے، پسپا ہے**—اور ہمیں دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہا؟

قبانی کے یہ اشعار مجھ سے کچھ اور لکھوانا چاہتے ہیں — **نعرے نہیں، نوحے نہیں، بلکہ ایک دستاویز گواہی۔**

کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب **جاہلیت جوتے پہن کر لندن کی گلیوں میں رقص کرنے لگی، تو شعور نے اپنی قبر میں دوبارہ لیٹ جانا بہتر جانا۔**

اور اگر میں اس آئینے کو تھوڑا سا جھکا کر اپنے معاشرے کی سمت موڑ دوں تو منظر مزید گندہ ہو جاتا ہے۔ یہاں سرخ بسیں تو نہ تھیں، لیکن خواب تھے—خواب جو منٹو، فیض، ن م راشد، اور جالب نے دیکھے تھے۔ مگر آج اُن خوابوں کی جگہ **بل بورڈز** ہیں، جن پر مصنوعی مسکراہٹوں والے لکھاری، پرفیوم پہنے "دانشور" اور اینکرز اپنے **مسلکی، سیاسی اور مالیاتی نرخ** کے ساتھ آویزاں ہیں۔

یہاں "نوق" نہیں، بلکہ "برانڈڈ ڈگریوں والے تجزیہ کار" فلیٹ اسٹریٹ کی نمائندگی کرتے ہیں، جو ہر شام خبروں میں **مغرب کے بنائے ہوئے نظریاتی لباس** پہن کر آتے ہیں، اور ایسے "دانش" بیچتے ہیں جو عوام کو **غلامی میں خوشی محسوس کرنا سکھاتی ہے۔**

یہاں بدو قصرِ بکنگھم میں داخل نہیں ہوئے، بلکہ **فکری اداروں، تھنک ٹینکس، جامعات اور ادبی انجمنوں** میں دھڑلے سے گھس آئے ہیں—اور جو بچا کھچا علم تھا، اسے **سستا، قابلِ اسپانسر، اور درباری تحریری اسٹائل** میں "ری-پیکیج" کر کے فروخت کر رہے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی "نعلین کی تالوں" پر شاعری ہو رہی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ وہ جوتے **کبھی کسی اینکر کے ہیں، کبھی کسی مذہبی کاسمیٹک بیانیے کے، کبھی کسی کرپٹ بزنس مین کے، اور کبھی ریاستی پروجیکٹس کے۔**

ہم نے بھی انگلینڈ کی طرح **اپنے انگریزوں کو رخصت کیا تھا**، لیکن ان کے جانے کے بعد ابو جہل ہم میں داخل ہوا—اور ہم نے خوشی سے اسے **جمہوریت، تعلیم، صحافت اور حق** کہ

آزادیِ رائے کی چابیاں تھما دیں۔

یہاں بھی وہی تماشا ہوا:

انگریزوں نے سامان باندھ کر کہا:

"اب ہمارا وقت تھا، وہ بھی گزر کر جا چکا،"

اور ہم نے، نئ غلامی کے فریم میں اپنی تصاویر لگا کر کہا:

"دیکھو، ہم آزاد ہو چکے ہیں۔"

مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم آزاد نہیں ہوئے—

ہم صرف **تاریخ کے پرانے غلاموں کی جگہ نئے چہرے** دیکھنے لگے ہیں۔

ہم نے تعلیمی نصاب سے سچ نکال کر **تاریخی فینٹیسی شامل کی**، ہم نے صحافت کو "سرکاری زبان" سکھائی، ہم نے ادب کو صرف **ایوارڈ اور اشاعت کے تابع کر دیا**، اور مذہب کو **صرف سیاسی ایجنڈے کے لیے استعمال کیا۔**

یہی وہ آشوب ہے جس میں ہمارا قاری، ہمارا شاعر، ہمارا طالب علم، اور ہمارا شہری سانس لے رہا ہے—

سانس لے رہا ہے، **مگر زندگی نہیں جی رہا۔**

کیونکہ جو فضا ابو جہل نے خرید لی ہو، وہاں سانس لینا بھی **اجازت سے مشروط** ہوتا ہے۔

عنترہ ہے رات بھر، رومی حسینہ کی تلاش،

سفید، جیسے دودھ کی بوندیں، بدن، فربہ، سبک۔

نرمی رانوں پہ جھکتا، ہجر کا دیوانہ وہ،

مل گئی گر، وقت میں باندھ لے ازراں کپک۔

عنترہ، جو عرب ادب کا رزمیہ ہیرو تھا، جس کی تلوار اس کی غیرت کی نمائندہ تھی، جو دشمن کے سامنے ڈٹ جانے کی مثال تھا—نزار قبانی کے ہاں اب **رات بھر رومی حسینہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ایک عاشقِ ران** بن چکا ہے۔

وہ اب کسی **نظریے**، کسی **جنگ**، کسی **سوال کا علمبردار نہیں**، بلکہ سفید جلد، نازک بدن، اور گورے رانوں کی زلف کا اسیر ہے۔

اور جیسے ہی وہ **اس مغربی حسن کی دسترس میں آتا ہے**، وہ فوراً "ازراں کیپ" یعنی کپڑے کا بندھن باندھتا ہے—گویا **آزادی، اختیار اور شعور** کی جگہ اُس نے **شہوت، مرعوبیت اور بندگی کا لباس پہن لیا ہے۔**

یہ صرف جنسی علامت نہیں—

یہ **فکری خودسپردگی، تہذیبی غلامی اور روحانی بانجھ پن** کی تصویر ہے۔

یہ بتاتا ہے کہ اب **تلوار والا عنترہ** ختم ہو چکا، **اب صرف بستر والا عنترہ باقی ہے۔**

اور اگر میں اپنے سماج کی جانب نظر گھماؤں تو مجھے ہر طرف "عصرِ جدید کا عنترہ" نظر آتا ہے—وہی جو **سوشل میڈیا پر مغربی جملے کاپی پیسٹ کرتا ہے، Netflix پر تہذیبی مرعوبیت کے نت نئے ایپی سوڈز دیکھتا ہے**، اور کسی گورے نام یا یونیورسٹی کی چھاپ دیکھ کر علم، علمیت اور مہارت کے سامنے **سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔**

ہمارے یہاں کا بھی "عنترہ" اب **کسی شاعری یا فکر کا عاشق نہیں**، بلکہ سفید رانوں، برانڈڈ جِلد، اور تیز خوشبو والے ایئر کنڈیشنڈ ویژن کا پجاری ہے۔ وہ اب نہ مزاحمت کرتا ہے، نہ نظریہ لکھتا ہے، نہ سوال پوچھتا ہے۔

بس اُسے ایک "رومی حسینہ" چاہیے—کبھی وہ **یورپ کا ویزا ہوتا ہے**، کبھی **کینیڈین پاسپورٹ**، کبھی **پُرتعیش این جی او**، اور کبھی **کسی مغربی تھنک ٹینک کی ای میل اپروول۔**

اور جیسے ہی اسے وہ رومی رانیں میسر آتی ہیں—وہ باندھ لیتا ہے "ازراں کیپ—"

یعنی وہ اپنا **ضمیر، قلم**، زبان، اور **آزادیِ رائے کا سارا جسمانی لباس تہذیبی خودسپردگی کے دھاگے سے جکڑ دیتا ہے۔**

یہی وہ آشوب ہے جہاں **ہماری جامعات، ہمارے جرائد، اور ہمارے ادیب** سب کسی نہ کسی "رومی ران" کے نشے میں سرشار ہیں۔

اور جو بچا ہے، وہ یا تو خاموش ہے، یا بھوکا ہے، یا پاگل قرار دیا جا چکا ہے۔

نزار قبانی کے عنترہ نے جس رومی کو ڈھونڈا، ہم نے اُسے **قرضوں، برانڈز، اسکالرشپس، ایوارڈز اور اسپانسرڈ کانفرنسز** میں پالیا۔

ہم بھی اب وہی "گھٹیا شاعری" کر رہے ہیں—

جس میں نہ جذبہ ہے، نہ جہت—بس سفید جلد کا ایک استعارہ ہے، اور اُسی کے گرد ہماری پوری شاعری اور نثر کی "طواف"۔

اور یہ عنترہ فقط عرب کا نہیں، نہ لندن کے فٹ پاتھوں تک محدود ہے — **یہ یہاں بھی ہے، ہمارے بیچ، ہمارے جسم میں، ہمارے قلم میں، ہماری آنکھوں میں**۔ وہی عنترہ جو بلوچستان کی **جلتی ہوئی زمین پر چمکتے ہوٹلوں سے ترقی کے قصے سناتا ہے**، پشتونخوا کے ہر گاؤں میں **بارود کی بُو میں "ریاستی بیانیے" کی خوشبو ملا دیتا ہے**، اور سندھ کے سوتے ہوئے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر **پانی چوری کو آسمانی منصوبہ قرار دیتا ہے**۔ وہی عنترہ جو سرائیکی وسیب کی زرعی زمینوں پر **قبضے کو زرعی انقلاب کا نام دیتا ہے**، اور پھر اُسی کو **کارپوریٹ پریزنٹیشنز میں "ڈیولپمنٹ ماڈل" کہہ کر پیش کرتا ہے**۔

اور جب لوگ سوال کرتے ہیں—جب کوئی شاعر چیختا ہے، جب کوئی طالبعلم ٹویٹ کرتا ہے، جب کوئی مزدور بینر اٹھاتا ہے—تو وہی عنترہ، جو کل تک رومی رانوں کی تلاش میں تھا، **آج فیس بک پوسٹوں، یوٹیوب چینلز، اور ایکسپریس۔ سلیبس صحافت میں بدل جاتا ہے**۔ وہ ہر طرف سے لن ترانیاں لے کر آتا ہے" **:ریاست دشمن"، "غدار"، "ایجنڈا زدہ"، "امن دشمن"، "ففتھ جنریشن وار کا مہرہ"**۔ یہ الزامات نہیں — **ابو جہل کا نیا اسلوبِ انکار** ہیں۔ اور یہی عنترہ اب ہمارے اندر بھی جڑیں پکڑ چکا ہے—

بس فرق اتنا ہے کہ اُس نے **عقال کی جگہ یونیفارم پہن لی ہے، نیزے کی جگہ کیمرہ پکڑ لیا ہے، اور صحرائی لہجے کی جگہ انگریزی ایکسنٹ اختیار کر لیا ہے**۔

بلوچستان کی ماں کے پاؤں میں زنجیر ہو یا خیبر کے بچے کے کاندھے پر بندوق،
سندھ کا خشک ہوتا دریائی سینہ ہو یا وسیب کے کسان کے چھینے گئے بیج —
یہ سب وہ سچ ہیں جن پر اگر کوئی شاعر خاموش ہے،
تو وہ صرف خاموش نہیں — وہ ابو جہل کا ترجمان ہے۔

اب یہاں پارکوں میں ہے نہ بطخ، نہ پھول، نہ سبزہ،
بکریاں چَرتی ہیں اب، اور پرندے اُڑ گئے۔
سبزیاں، پرچھائیاں، اور ہوا بھی چھن گئی،
آسمانوں سے پرندے — بے خبر، بے دم گئے۔

یہ عباسی نسلیں اب، داخلِ میٹرو ہوئیں،
بئیر کے جاموں کو پی پی، نوچتی ہیں جسم کو۔
کھاتی ہیں نِصفِ ناز، ہر عورتِ مغرب سے یوں،
جیسے خُونِ حُسن چکھتی ہو دریدہ چشم ہو۔

کیا یہی اب بورصۂ ریال ہے، تاج ہے؟
کیا یہ انگلینڈ بن گئی خلافتوں کی راج ہے؟
کیا یہی وہ شاہراہِ صحافت ہے، جہاں،
چل رہا تیل، بادشاہی کے سے انداز ہے؟

اب یہاں، یعنی لندن میں نہیں، بلکہ ہمارے شعور میں بھی نہ بطخ بچی ہے، نہ پھول، نہ پرندے۔ پارک فقط جسمانی جگہیں نہیں ہوتیں، وہ ایک تہذیب کے سانس لینے کی جگہ ہوتی ہیں — مگر یہاں تو سانس بھی اب سودا بن چکی ہے۔ پرندے اُڑ گئے — یا شاید پرندوں کو پر مارنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی۔

نزار قبانی کے یہ مصرعے فقط ایک شہری منظرنامے کی ویرانی نہیں، بلکہ **فکری و روحانی بانجھ پن** کا نوحہ ہیں۔
اور جب وہ لکھتے ہیں کہ "بکریاں چرتی ہیں اب"، تو وہ دراصل اس سچائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جہاں **دلیلیں، نغمے اور خواب چرنے چاہئیں تھے، اب وہاں چرتی ہے صرف جاہلیت**،

عباسی نسلیں میٹرو میں داخل ہو چکیں — مگر ان کے ذہن ابھی تک **خیموں، خرافات اور قبائلی تفخر** سے باہر نہیں نکلے۔
وہ بئیر پیتے ہیں، پر نشہ انہیں **تہذیب یا تنقید کا نہیں آتا** — انہیں نشہ آتا ہے **خرید لینے کا، نوچ لینے کا، اپنی کم ظرفی کو آزادی کہنے کا**۔
وہ مغربی عورت کے جسم کو اپنی **قوم پرستی کی نامردی کا انتقام** سمجھ کر نوچتے ہیں — جیسے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ **جسموں پر جبر سے تاریخ کا زخم بھر سکتا ہے**۔
مگر یہ صرف **نسلِ عباسی کا زوال** نہیں — یہ ہر اُس نام نہاد **مہذب طبقے کا چہرہ** ہے، جو دنیا بھر میں استحصال کو "ایلیٹ کلچر" کے لباس میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔

پھر سوال اٹھتا ہے:
کیا یہی ہے بورصۂ ریال؟ کیا یہی وہ شاہراہ ہے جہاں **نقدِ خیال کی جگہ نقدِ تیل** چلتا ہے؟ کیا یہی وہ صحافت ہے جہاں اب اخبار نہیں، **بادشاہوں کی چالیں** چھپتی ہیں؟ کیا یہی ہے وہ سچ جس کے لیے ہزاروں قلم خریدے گئے، انعامات دیے گئے، اور جلاوطن شعرا کو **گھروں کی قسطوں میں خاموشی بیچنے پر مجبور کیا گیا**؟

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں، وہاں **جمہوریت بھی بادشاہی انداز میں پیش کی جاتی ہے**، اور "آزادیِ صحافت" کے بورڈ تلے **سلطانی فرمان جاری ہوتے ہیں**۔
یہی وہ دنیا ہے، جہاں **نعلین کی آواز جمہور کی دھڑکن کہلاتی ہے، اور قینچی کو اظہار کا فن**۔

اخبار سب، ناصیہ پر، منتظر، گاہک کی ہے،

جیسے ہو وہ باندیاں، جو جسم بیچیں خامشی۔

آئیں تھیں لندن میں یہ، جھومتی، آزادی لیے،

پر ہو گئیں وہ سب اسی بازار کی اک جنس ہی۔

آئے تھے یورپ کی جانب، علم کا رس پینے کو ہم،

تلاشِ اک کھڑکی دریا، جو کھلے، سانسوں کے نام۔

جب گھٹن نے بند کر دی گوشۂ صدفوں کی زباں،

آئے تھے، لکھنے کو ہم، اپنے جنوں کے التیام۔

پر جب صحافت ہاتھ آئی، حرف گونگا ہو گیا،

ہاں، ہمارے جملے سب، بیچاری بیضہ ہو گئے۔

سوچ کی وہ سب جُہتیں جو تھیں سمندر کی طرح،

ٹھنڈی ہو کر موم سی، ایڈیٹوریل ہو گئے۔

ہم جو آئے تھے یہاں، تا چکھ سکیں کچھ تازگی،

آسمانوں کا بھی پوچھا رنگ کیسا ہے وہاں؟

ہم جو آئے تھے یہاں، قہر سے، دا حس سے، دور،

اک کبوتر تک نہ دیکھا، اک گلابی روشناں۔

بس رہی صحرا ہمارے باطنوں میں، دل میں تھی،
برف تھی باہر، مگر اندر سلگتی ریت تھی۔

اخبارات ناصیہ پر منتظر کھڑے ہیں—
مگر خبر کی نہیں، قارئین کے جسمانی درجہ حرارت کی۔
خبر اب **بکاؤ مال ہے، کالم اب کرائے کی بولی میں ہوتا ہے،** اور تجزیہ اب "حسنِ ظن" کی شرط پر لکھا جاتا ہے۔
نزار قبانی نے کہا تھا کہ "یہ سب اخبار باندیوں کی مانند ہیں—"
اور سچ یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنی صحافت کو **ریاستی بستر کا ترجمان** بنا دیا ہے۔
وہی اخبار، جو آزادی کے نعروں کے ساتھ کھلے تھے، آج **تادیب کے مراکز** بن چکے ہیں۔
جو صحافی بیرونِ ملک سچ کے عَلم بردار تھے، وہ آج ملک کے اندر "قومی بیانیے کے ٹوئٹر ورژن" ہیں۔

ہم بھی یہاں آئے تھے — نہیں، "ہم" صرف وہ نہیں جو جہاز پکڑ کر لندن پہنچے۔
ہم وہ بھی ہیں جو روز اِس شہر کے اندر ہجرت کرتے ہیں، اپنا سچ لے کر بقا کی تلاش میں۔
ہم بھی گھٹن سے نکلے تھے — اُس گھٹن سے، جہاں **سوال پوچھنے پر وطن دشمنی کی مہر لگتی ہے،**
جہاں خواب دیکھنے پر غداری کے مقدمے بنتے ہیں، اور جہاں علم بانٹنے پر فتوے پڑتے ہیں۔
ہم بھی کھڑکیاں چاہتے تھے، تازہ ہوا، ایک نیلا آسمان—
لیکن ہمیں دیا گیا **صرف ایڈیٹوریل فارم،** جس میں صرف اتنا ہی سچ بولا جا سکتا ہے **جتنا مالکان اور مقتدرہ** کو ہضم ہو۔

ہمارے اندر کا کبوتر بھی اب پر نہیں مارتا۔
نزار قبانی نے کہا "اک کبوتر تک نہ دیکھا—"
ہم نے دیکھا بھی تو وہ کبوتر نہیں تھا، وہ **امن کانفرنس کا علامتی پرندہ** تھا، جس کی چونچ میں **امن کا مصنوعی زیتون** دبا تھا، اور جس کے پیچھے **ریاستی برانڈنگ** کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔

اور آج، ہم سب کے دل میں وہی صحرا ہے—
بس باہر برف ہے، سفارتی زبان، پُر اطمینان بیانیہ، سرکاری ثقافت،
مگر اندر ایک ریت سلگ رہی ہے، جس پر نہ کوئی قافلہ بچا، نہ کوئی شاعر باقی۔

یہ ریاست—جی ہاں، ہماری ریاست—
ہم سے صحافت چھین کر ہمیں پریس ریلیز دے دیتی ہے،
ہم سے شعر چھین کر نغمے مانگتی ہے،
ہم سے سوال چھین کر حب الوطنی کا ڈنڈا مارتی ہے،
اور کہتی ہے:
"یہی آزادی ہے، یہی ترقی ہے، یہی تمہارا آسمان ہے"!

نزار قبانی نے لندن کے خواب کو دفن ہوتے دیکھا—
ہم نے یہاں، **اپنے ہی بستر پر خواب کے بجائے سرکاری اعلامیے کو لیٹا پایا ہے۔**
اور اب اگر ہم خاموش رہیں تو یہ **گھٹن فقط گھٹن نہیں رہے گی، یہ آگ بن جائے گی۔**

اک خدا کے واسطے سب سر جھکاتے جا رہے،
ہر سرورق پر اُس کے جھوٹے مدح نامے ہیں۔
چاپلوسی کے یہ لشکر، اُس کے آگے گر پڑے،
چومتے ہیں پاؤں جیسے کعبہ کی دیوار ہو۔

پوچھتا ہوں، یہ صحافت ہے، کہ ہے صرّاف کا،
دفترِ زر، یا کوئی منڈی ہے درباری قلم؟

بات کوئی کہہ نہ پائے، ہر سخن زنجیر میں،
ہر کتابِ فکر پر، اب دستخط ہیں صلب کے۔

کیا سمجھ پائے گا وہ، جو بولنے سے قاصر ہے؟
کیا سنبھالے گا وہی، جو خواب میں بھی گم رہے؟

جو بھی بننا چاہے اک دن، رئیسِ التحریر،
اس کو لازم ہے، کہ صبح و شام، چوکے در پہ جا۔
رکبۂ سلطان پر، بوسے نچھاور کر کے وہ،
چار پایوں پر چلے، تا چڑھ سکے تختِ ہوا۔

حاکموں کو در حقیقت، اہلِ فن مطلوب نہیں،
چاہتے ہیں وہ فقط، مزدور سے اک جی حضوری۔

یہاں اک خدا کے واسطے سب سر جھکاتے جا رہے ہیں — مگر وہ خدا نہ تو سوالوں کا خالق ہے، نہ علم کا ضامن، نہ آزادی کا نقیب۔

یہ خدا دراصل **پاور کا استعارہ** ہے — ریاست ہو، ادارہ ہو، سرمایہ ہو، یا صرف ایک نیلا نشان زدہ اکاؤنٹ — ہر زبان اسی کے حضور جھکی ہے۔

ہر سرورق پر **جھوٹے مدح نامے، بیانیاتی بوسے، اور درباری سچائیوں کے طبلے** بج رہے ہیں۔

چاپلوسی یہاں اب **فنی مہارت** کہلاتی ہے، اور جو کسی کی بارگاہ میں دو بار گھٹنے ٹیک لے، وہ **"سینئر اینالسٹ"** بن جاتا ہے۔

نزار قبانی نے کہا تھا کہ لوگ اُس کے پاؤں چومتے ہیں جیسے کعبہ کی دیوار ہو —
ہمارے یہاں **ہیش ٹیگ چومے جاتے ہیں، ری ٹویٹ کو سجدہ کیا جاتا ہے، اور فالوورز کی گنتی سے انسان کا اخلاق ناپا جاتا ہے۔**

اب صحافت صحافت نہیں، **ایک صراف کا دفتر ہے — سونے کے نرخ پر بکنے والے نظریات، تیل سے تر بریفنگز، اور حب الوطنی کی قسط وار ادائیگی۔**

یہاں کسی اخبار کی "ادارتی رائے" بھی دراصل **کسی کال پر اُتری ہوئی رائے** ہے۔
رئیس التحریر وہی بنتا ہے، جو ہر صبح دربار میں حاضری لگاتا ہے، جو بوسہ بار رینگتا ہے، اور جو جانتا ہے کہ **چارپایوں پر چلنے کی ریاضت** ہی سرفرازی کی سند ہے۔

اور یہی حال ادب کا ہے — جو خود کو کبھی "مزاحمتی" کہتا تھا، آج وہ **سازگار ادبی میلوں کا** اشتہاری پمفلٹ بن چکا ہے۔
ادب کی چوکھٹ اب صرف اُن قلموں کے لیے کھلتی ہے جو ریاستی خوشنودی کی شرط پوری کرتے ہوں، **جو اپنے فن کو سفارتی ضیافتوں میں بدلنے کا فن جانتے ہوں۔**

اور سوشل میڈیا؟
وہ اب **ایک ڈیجیٹل دربار** ہے — جہاں کوئی بات کسی بادشاہ کی اجازت کے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔
جہاں **"قومی مفاد" ایک الجوردم ہے، اور "سیاسی شعور" ایک جرم۔**
جہاں ہر تنقید کو ملک دشمنی، ہر سوال کو مایوسی، اور ہر سچ کو دشمن کی سازش قرار دینے والے **فیک آئی ڈیز نہیں، بلکہ حقیقی ادارے ہیں۔**

اور یہی وجہ ہے کہ **ہمارے ہاں نہ اہلِ فن باقی بچے، نہ اہلِ ضمیر۔**
کیونکہ ہمارے حکمران، ہمارے ادارے، ہمارے چینلز، اور ہمارے دانشور — کسی "مبدع" کو نہیں چاہتے،
بلکہ ایک ایسا "اجیر" چاہتے ہیں جو لفظوں میں صرف "جی حضور" لکھے، اور اس پر صدارتی تمغہ وصول کرے۔

لمحہ بھر کو، طولِ عمر والا جو اک فرمان دے،
پھر وہی اخباریے — کتا، بھونکے نظم میں۔
گالیوں کی گونج میں تخلیق کے سب پھول تھے،
منظم آواز میں، زخموں پہ چھپاں خون تھے۔

اور ہمارے "بائیں بازو" کے وہ سب مفکرین،
چھوڑ کر لینن کو، اب اونٹوں پہ یوں سوار ہیں۔
اک زمانہ تھا کہ ان کی بات میں آتش تھی پر،
اب وہ تاجر ہیں فقط، سرمایہ کے ہونہار ہیں۔

تھے جو آئے، آزادیِ اظہار کی طلب لیے،
تھے جو آئے، تاکہ دھولیں گرد جسم وجاں کی وہ،
تھے جو آئے، تا اگائیں پھول اپنی روح میں،
آ گئے آخر، اسی اسکندری مَسکن میں ہم۔

وہ پرندے، جو فلک پر گیت گاتے تھے کبھی،
بیروت کی نیلی فضا میں، نغمگی پھیلائے تھے،
تیل نے جلادی ان کی کھال، ان کے پر، صدا،
اور وہ سب لندن کی چھت پر، چپ، پڑے مرجھائے تھے۔

قلم کو یہ لوگ اب باندھتے ہیں اپنے جوتے سے،
جب تلک باقی رہے سیاہی و تحریر میں،
پھر وہی مفکر، وہی شاعر، ہوا میں پھینک دیں،
جیسے ہو استعمال شدہ کوئی کچھ کاغذ دھواں۔

کافی ہے بس ایک لمحہ —ایک مختصر فرمان —طولِ عمر والے منبع سے آجائے،
توسب اخبار یے، کتے کی مانند بھونکنے لگتے ہیں، نظم کی دُم ہلا کر درباری قافیہ نکالتے ہیں۔
تخلیق کے پھولوں پر اب **گالیوں کی کھاد** ڈالی جاتی ہے،
اور زخموں پر **ریٹنگ کے بند باندھ** کر دکھایا جاتا ہے کہ قوم ترقی کر رہی ہے۔
یہ صحافت نہیں، یہ **شتر بے مہار دروغ گوئی** ہے —
جس نے حروف کو پرچم کے رنگ سے **پینٹ کر کے بازار میں رکھ دیا ہے**۔

اور وہ سب "بائیں بازو" کے مفکرین؟
جن کے ہونٹوں سے "انقلاب" ٹپکتا تھا؟
جن کے بینر پر **لینن، مارکس، فیض، جالب** مسکرا رہے تھے؟
آج وہ سب اونٹوں پر سوار ہیں —وہی اونٹ جو **ڈالر کی تھوتھنی سے بندھے، ریاستی پالشیے بن چکے ہیں**۔
اب اُن کی زبان میں آتش نہیں، **آفیشل بریفنگز کا سرد لہجہ** ہے۔
اب وہ **علم نہیں بیچتے، اشتہار بیچتے ہیں** —اور ہر سوال کو "پراسرار ایجنڈا" کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

ہم جو آئے تھے یہاں — **خارج میں، یا شعور کے اندر** — سانس لینے، اپنی ذات دھونے، نئی ہوا کو محسوس کرنے،
ہم بھی آج **اسی اسکندری محل میں رہتے ہیں** —جہاں اندر کے صحرا پر **باہر کی برف سجائی جاتی ہے**۔
جہاں بیروت کے نیلے پرندے جو کبھی آسمانوں میں نغمہ لکھتے تھے،
اب لندن کی چھت پر **ریاستی مفاہمت کے کبوتر** بن کر، **چپ چاپ مرجھا چکے ہیں**۔

اور قلم؟
اب وہ قلم "ہاتھ" میں نہیں، **جوتے میں باندھا جاتا ہے**۔
جب تک اُس میں سیاہی باقی ہو، وہ **حکمرانِ وقت کے کارندے کی جیب میں رہتا ہے**۔
اور جب خشک ہو جائے،
تو وہی شاعر، وہی مفکر — **کچرے کی مانند فضا میں اچھال دیا جاتا ہے**۔

استعمال شدہ کاغذ، جس پر کبھی سچ لکھا گیا تھا—
اب اُس کی راکھ بھی **ایڈیٹوریل صفحے** سے **بلیک لسٹ** کر دی جاتی ہے۔

یہ ہے وہ سچ—وہ زہر—جو اس ریاست، اس سماج، اس صحافت، اس ادب، اور اس
مصنوعی دانش کی رگوں میں رچ چکا ہے۔
اور جب تک ہم اس جھوٹ کو آگ میں نہ جھونکیں—
تب تک ہر نظم، ہر کالم، ہر خبر—فقط **ابو جہل کا نیا اشتہار** ہو گی۔

یہ فلاناکاتبِ ہفتہ، یہ کالم خاص ہے،
دیکھ لے، سجدے کے زاویے، رکوع و قعدہ سب۔
لفظ ہو، یا سطر ہو، یا زاویۂ تسبیح ہو،
سب میں رینگے بس غلامی کا ریاکار اک ادب۔

خامشی لازم ہے، تو محفوظ ہے تیرا وجود،
بحث مت کر بندوقوں سے، نہ بادشاہوں سے کبھی۔
رنگ، خوشبو، ذائقہ سب، رائے، نظریہ، مٹا،
بس لکھو موسم پہ، یا گولیوں سے بچنے کی دوا۔

کس طرح ممکن ہے تحریر کا آغاز ہو؟
جب نگاہوں میں ہو صحرا، اور دھوپیں لو کی ہوں؟
جب قلم انکار میں ذبحہ ہو جیسے کوئی بیل،
اور لبوں پر ہو خموشی کی وہ بیڑی جو کٹی ہو۔

اے طویل العمر! اے زن کو خریدنے والے،
قلموں کو بھی تو تُو تولتا ہے جیسے گوشت کو۔
ہم کو تجھ سے کچھ نہیں درکار، کچھ بھی، کچھ نہیں،
اپنی حوریں رکھ، ہمیں بس دے ثقافت کی نمو۔

تو اگر چاہے تو پی جا تیل کا ہر آخری قطرہ،
پر ہمیں دے صرف اک مقتل، جہاں ہم سوچ لیں۔
قید کر لے جسم کو، پر فہم کو زنجیر نہ کر،
بس یہی لب آزاد رہ جائیں، یہی تخلیق ہو۔

تو اب آخر میں ہم کیا کہیں؟

یہ فلانا کاتب ہفتہ، یہ مخصوص کالم نویس، یہ طے شدہ زاویے—سب ایک ایسی نماز لکھ رہے ہیں جس کا **قبلہ دربار کی کرسی کے رخ پر مقرر رہے۔**
رکوع ہو یا سجدہ، قعدہ ہو یا دعائے قنوت—سب میں بس ایک ہی بندگی ہے:
ریاستی خوشنودی، سرمایہ دارانہ احکام، اور اقتدار کی قربت۔
لفظ جو کبھی بغاوت کے نشان ہوا کرتے تھے،
آج **حکمرانِ وقت کے لیے خوشبودار دعاؤں میں بدل چکے ہیں۔**

خاموشی یہاں لازم ہے، محفوظ بھی—
بس مت بول، نہ گولی پر، نہ گالی پر، نہ جنرل پر، نہ جاگیردار پر، نہ مولوی پر۔
بس لکھ—موسم پہ، کزن کی شادی پہ، یا وہ بھی نہیں تو **حمل روکنے کی گولیاں تجویز کر دے—**
بس مت لکھ وہ جو سچ ہو۔

اور اگر لکھنے کی ضد ہے، تو پہلے پوچھ:
کیا یہ سچ کسی کے پیٹ میں درد تو نہیں کرے گا؟

کیا اس میں انکار کا لہجہ ہے؟
کیا اس میں کسی زندہ سوال کی بازگشت تو نہیں؟
کیونکہ اگر ہے، تو یاد رکھ—
قلم ذبح ہوگا، لب سلے جائیں گے، اور وہ بھی ہاتھ چومنے کا حکم صادر ہوگا جس کے پاؤں کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی۔

ہم اُن سے کچھ نہیں چاہتے—
اے طویل العمر، اے زن کو تولنے والے،
اپنی حوریں، اپنی حویلیاں، اپنے ہیرے، اپنے ایوان—سب اپنے پاس رکھ۔
ہمیں بس ثقافت کی نمو دے دے—وہ زمین جس پر ہم سوال اگا سکیں، وہ فضا جس میں ہمارا جملہ سانس لے سکے۔

تو اگر چاہے، تو پی جا تیل کا ہر آخری قطرہ۔
چاہے تو ہر خبر کو خرید لے، ہر ادیب کو پٹا لے، ہر اخبار کو پال لے۔
پر ہمیں دے صرف ایک مقتل — **جہاں ہم سوچ سکیں، لکھ سکیں، بول سکیں، مر سکیں۔**

ہمیں صرف اتنی آزادی دے—
کہ ہم اپنی شکست کا سچ لکھ سکیں،
اپنے زخم کو لفظ دے سکیں،
اور اپنی قوم کی بند آنکھوں میں ایک سطر رکھ سکیں—
"یہ نظم ابھی مکمل نہیں ہوئی۔"